سُورَۃُ الحَآقَّۃِ 69 رکوعاتہا 2
مَکِّیَّۃٌ 78 آیاتہا 52

نام

سورت کے پہلے ہی لفظ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول

یہ بھی مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے اور اس کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس زمانہ میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ کی مخالفت تو شروع ہوچکی تھی، مگر اس نے ابھی زیادہ شدت اختیار نہ کی تھی۔ مسند احمد میں حضرت عمر فاروقؓ کی روایت ہے کہ اسلام لانے سے پہلے ایک روز میں رسول اللہ ﷺ کو ستانے کے لیے گھر سے نکلا مگر آپ مجھ سے پہلے مسجد حرام میں داخل ہوچکے تھے۔ میں پہنچا تو آپ نماز میں سورۃ الحاقہ پڑھ رہے تھے۔ میں آپ کے پیچھے کھڑا ہوگیا اور سننے لگا۔ قرآن کی شان کلام پر میں حیران ہو رہا تھا کہ میرے دل میں یکایک خیال آیا کہ یہ شخص ضرور شاعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ فوراً ہی حضور ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے "یہ ایک رسول کریم کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں"۔ میں نے اپنے دل میں کہا شاعر نہیں تو پھر کاہن ہے۔ اسی وقت زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے "اور نہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ تو رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔ یہ سن کر اسلام میرے دل میں گہرا اتر گیا۔ حضرت عمرؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت ان کے قبول اسلام سے بہت پہلے نازل ہوچکی تھی، کیونکہ اس واقعہ کے بعد بھی ایک مدت تک وہ ایمان نہیں لائے تھے اور وقتاً فوقتاً متعدد واقعات ان کو اسلام سے متاثر کرتے رہے تھے، یہاں تک کہ اپنی بہن کے گھر میں ان کے دل پر وہ آخری ضرب لگی جس نے ان کو ایمان کی منزل پر پہنچا دیا (مزید دیکھیے: سورۃ مریم اور سورۃ واقعہ)

موضوع اور مضمون

اس کا پہلا رکوع آخرت کے بیان میں ہے، اور دوسرا رکوع قرآن کے منزل من اللہ اور محمد ﷺ کے رسول برحق ہونے کے بارے میں ہے۔

پہلے رکوع کا آغاز اس بات سے ہوا ہے کہ قیامت کا آنا اور آخرت کا برپا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو ضرور پیش آ کر رہنی ہے۔ پھر آیت ۴ سے ۱۲ تک یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا ہے وہ آخرکار خدا کے عذاب کی مستحق ہو کر رہی ہیں۔ اس کے بعد آیت ۱۷ تک قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ وہ کس طرح برپا ہوگی۔ پھر آیت ۱۸ سے ۳۷ تک وہ اصل مقصد بیان کیا گیا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی موجودہ زندگی کے بعد نوع انسانی کے لیے ایک دوسری زندگی مقدر فرمائی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس روز تمام انسان اپنے رب کی عدالت میں پیش ہوں گے جہاں ان کا کوئی راز چھپا نہ رہ جائے گا، ہر ایک کا نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا

جن لوگوں نے دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی تھی کہ ایک دن انہیں اپنے رب کو حساب دینا ہے، اور جنہوں نے دنیا کی زندگی میں نیک عمل کر کے اپنی آخرت کی بھلائی کے لیے پیشگی سامان کرلیا تھا، وہ اپنا حساب پاک دیکھ کر خوش ہوجائیں گے اور انہیں جنت کا ابدی عیش نصیب ہوگا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے خدا کا حق مانا نہ بندوں کا حق ادا کیا، انہیں خدا کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا اور وہ جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوجائیں گے۔

دوسرے رکوع میں کفار مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم اس قرآن کو ایک شاعر اور کاہن کا کلام کہتے ہو، حالانکہ یہ اللہ کا نازل کردہ کلام ہے جو ایک رسول کریم کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ رسول اس کلام میں اپنی طرف سے ایک لفظ گھٹانے یا بڑھانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اگر وہ اس میں اپنی من گھڑت کوئی چیز شامل کر دے تو ہم اس کی رگ گردن (رگ دل) کاٹ دیں۔ یہ ایک یقینی برحق کلام ہے اور جو لوگ اسے جھٹلائیں گے انہیں آخر کار پچھتانا پڑے گا۔

رکوعاتہا 2   69 سُوۡرَۃُ الۡحَآقَّۃِ مَکِّیَّۃٌ 78

اٰیاتہا 52

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَآقَّۃُ ۙ﴿۱﴾

ہونی شدنی!

اصل میں لفظ الحاقہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں وہ واقعہ جس کو لازماً پیش آ کر رہنا ہے، جس کا آنا برحق ہے، جس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ قیامت کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا اور پھر کلام کا آغاز ہی اس سے کرنا خود بخود یہ ظاہر کرتا ہے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو اس کے آنے کو جھٹلا رہے تھے۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ جس چیز کی تم تکذیب کر رہے ہو وہ ہونی شدنی ہے، تمہارے انکار سے اس کا آنا رک نہیں جائے گا۔

مَا الۡحَآقَّۃُ ۚ﴿۲﴾

کیا ہے وہ ہونی شدنی؟

وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحَآقَّۃُ ؕ﴿۳﴾

اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے ہونی شدنی؟ (۲)

(۲) ۔ یکے بعد دیگرے یہ دو سوالات سامعین کو چونکانے کے لیے کیے گئے ہیں تاکہ وہ بات کی اہمیت کو سمجھیں اور پوری توجہ کے ساتھ آگے کی بات سنیں۔

کَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ وَ عَادٌۢ بِالۡقَارِعَۃِ ﴿۴﴾

ثمود (۳) اور عاد نے اُس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت (۴) کو جھُٹلایا

(۳) ۔ کفار مکہ چونکہ قیامت کو جھٹلا رہے تھے اور اس کے آنے کی خبر کو مذاق سمجھتے تھے اس لیے پہلے ان کو خبردار کیا گیا کہ وہ تو ہونی شدنی ہے، تم چاہے مانو یا نہ مانو، وہ بہرحال آکر رہے گی۔ اس کے بعد اب ان کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ معاملہ صرف اتنا سادہ سا معاملہ نہیں ہے کہ کوئی شخص ایک پیش آنے والے واقعہ کی خبر کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں، بلکہ اس کا نہایت گہرا تعلق قوموں کے اخلاق اور پھر ان کے مستقبل سے ہے۔ تم سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے بھی آخرت کا انکار کر کے اسی دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھا اور اس بات کو جھٹلا دیا کہ انسان کو آخر کار خدا کی عدالت میں اپنا حساب دینا ہوگا، وہ سخت اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہوئی، یہاں تک کہ خدا کے عذاب نے آ کر دنیا کو اس کے وجود سے پاک کردیا۔

(۴) ۔ اصل لفظ القارعہ ہے۔ قرع عربی زبان میں ٹھوکنے، کوٹنے، کھڑکھڑا دینے، اور ایک چیز کو دوسری چیز پر مار دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قیامت کے لیے یہ دوسرا لفظ اس کی ہولناکی کا تصور دلانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

فَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَاُهۡلِكُوۡا بِالطَّاغِيَةِ ۵
تو ثمود ایک سخت حادثہ (۵) سے ہلاک کیے گئے

(۵) ۔ سورۃ اعراف، آیت ۷۸ میں اس کو الرجفہ (زبردست زلزلہ) کہا گیا ہے۔ سورۃ ہود، آیت ٦۷ میں اس کے لیے الصیحہ (زور کے دھماکے) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ حمٰ السجدہ، آیت ۱۷ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کو صاعقۃ العذاب (عذاب کے کڑکے) نے آ لیا اور یہاں اسی عذاب کو الطاغیہ (حد سے زیادہ سخت حادثہ) سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ ایک ہی واقعہ کی مختلف کیفیات کا بیان ہے۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍ ۶
اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کردیے گئے

سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ سَبۡعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوۡمًا فَتَرَى الۡقَوۡمَ فِيۡهَا صَرۡعٰى كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ ۷
اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا۔ (تم وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔

فَهَلۡ تَرٰى لَهُمۡ مِّنۡۢ بَاقِيَةٍ ۸
اب کیا ان میں سے کوئی تمہیں باقی بچا نظر آتا ہے ؟

وَجَآءَ فِرۡعَوۡنُ وَمَنۡ قَبۡلَهٗ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتُ بِالۡخَاطِئَةِ ۹

اور اسی خطائےعظیم کا ارتکاب فرعون اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور تل پٹ ہوجانے والی بستیوں (٦) نے کیا ہے

(٦) ۔ مراد ہیں قوم لوط کی بستیاں جن کے متعلق سورۃ ہود (آیت ٨٢) اور سورۃ حجر (آیت ٧۴) میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔

فَعَصَوۡا رَسُوۡلَ رَبِّہِمۡ فَاَخَذَہُمۡ اَخۡذَۃً رَّابِیَۃً ﴿۱۰﴾
ان سب نے اپنے رب کے رسول کی بات نہ مانی تو اس نے ان کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الۡمَآءُ حَمَلۡنٰکُمۡ فِی الۡجَارِیَۃِ ﴿۱۱﴾
جب پانی کا طوفان حد سے گزر گیا (٧) تو ہم نے تم کو کشتی میں سوار کر دیا تھا (٨)

(٧) ۔ اشارہ ہے طوفان نوح کی طرف جس میں ایک پوری قوم اسی خطائے عظیم کی بنا پر غرق کردی گئی اور صرف وہ لوگ بچا لیے گئے جنہوں نے اللہ کے رسول کی بات مان لی تھی۔

(٨) ۔ اگرچہ کشتی میں سوار وہ لوگ کیے گئے تھے جو ہزاروں برس پہلے گزر چکے تھے، لیکن چونکہ بعد کی پوری انسانی نسل انہی لوگوں کی اولاد ہے جو اس وقت طوفان سے بچائے گئے تھے، اس لیے فرمایا کہ ہم نے تم کو کشتی میں سوار کرا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ تم آج دنیا میں اسی لیے موجود ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس طوفان میں صرف منکرین کو غرق کیا تھا، اور ایمان لانے والوں کو بچا لیا تھا۔

لِنَجۡعَلَہَا لَکُمۡ تَذۡکِرَۃً وَّ تَعِیَہَاۤ اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ ﴿۱۲﴾
تاکہ اس واقعہ کو تمہارے لیے ایک سبق آموز یادگار بنادیں اور یاد رکھنے والے کان اس کی یاد محفوظ رکھیں (٩) ۔

(٩) ۔ یعنی وہ کان نہیں جو سنی ان سنی کردیں اور جن کے پردے پر سے آواز اچٹ کر گزر جائے، بلکہ وہ لوگ جو اس واقعہ کو سن کر اسے یاد رکھیں، اس سے عبرت حاصل کریں اور اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ آخرت کے انکار اور خدا کے رسول کی تکذیب کا انجام کیسا ہولناک ہوتا ہے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ نَفۡخَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ﴿۱۳﴾
(١٠) پھر جب ایک دفعہ صور میں پھونک مار دی جائے گی

(١٠) ۔ آگے آنے والی بات کو پڑھتے ہوئے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ قرآن مجید میں کہیں تو قیامت کے تین مراحل الگ الگ بیان کیے گئے ہیں جو یکے بعد

دیگرے مختلف اوقات میں پیش آئیں گے، اور کہیں سب کو سمیٹ کر پہلے مرحلے سے آخری مرحلے تک کے واقعات کو یکجا بیان کردیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورة نمل آیت ۸۷میں پہلے نفخ صور کا ذکر کیا گیا ہے جب تمام دنیا کے انسان یک لخت ایک ہولناک آواز سے گھبرا اٹھیں گے۔ اس وقت نظام عالم کے درہم برہم ہونے کی وہ کیفیات ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آئیں گی جو سورة حج آیات ۱۔ ۲، سورة یٰسین آیات ۴۹۔ ۵۰ اور سورة تکویر آیات ۱۔ ٦میں بیان ہوئی ہیں۔ سورة زمر آیات ٦٧ تا ۷۰میں دوسرے اور تیسرے نفخ صور کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک نفخ پر سب لوگ مر کر گر جائیں گے اور اس کے بعد جب پھر صور پھونکا جائے گا تو سب جی اٹھیں گے اور خدا کی عدالت میں پیش ہوجائیں گے۔ سورة طٰہٰ آیات ۱۰۲ تا ۱۱۲، سورة انبیاء آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳، سورة یٰسین آیات ۵۱تا ۵۳، اور سورة ق آیات ۲۰تا ۲۲ میں صرف تیسرے نفخ صور کا ذکر ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، طٰہٰ ، حاشیہ ۷۸۔ الحج، حاشیہ ۱۔ جلد چہارم، یٰسین، حواشی ۴٦۔ ۴۷)۔ لیکن یہاں اور بہت سے دوسرے مقامات پر قرآن میں پہلے نفخ صور سے لے کر جنت اور جہنم میں لوگوں کے داخل ہونے تک قیامت کے تمام واقعات کو ایک ہی سلسلے میں بیان کردیا گیا ہے۔

وَّ حُمِلَتِ الۡاَرۡضُ وَالۡجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ۱۴

اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کردیا جائے گا ،

فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ۝١٥
اس روز وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ۝١٦
اس دن آسمان پھٹے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑجائے گی۔

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ؕ۝١٧
فرشتے اس کے اطراف و جوانب میں ہوں گے اور آٹھ فرشتے اس روز تیرے رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے (۱۱) ۔

(۱۱) ۔ یہ آیت متشابہات میں سے ہے جس کے معنی متعین کرنا مشکل ہے۔ ہم نہ یہ جان سکتے ہیں کہ عرش کیا چیز ہے اور نہ یہی سمجھ سکتے ہیں کہ قیامت کے روز آٹھ فرشتوں کے اس کو اٹھانے کی کیفیت کیا ہوگی۔ مگر یہ بات بہرحال قابل تصور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوگا اور آٹھ فرشتے اس کو عرش سمیت اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ آیت میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا ہوگا، اور ذات باری کا جو تصور ہم کو قرآن مجید میں دیا گیا ہے وہ بھی یہ خیال کرنے میں مانع ہے کہ وہ جسم اور جہت اور مقام سے منزہ ہستی کسی جگہ متمکن ہو اور کوئی مخلوق اسے اٹھائے۔ اس لیے کھوج کرید کر کے اس کے معنی متعین کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو گمراہی کے خطرے میں مبتلا کرنا ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی حکومت و فرمانروائی اور اس کے معاملات کا تصور دلانے کے لیے لوگوں کے سامنے وہی نقشہ پیش کیا گیا ہے جو دنیا میں بادشاہی کا نقشہ ہوتا ہے، اور اس کے لیے وہی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں جو انسانی زبانوں میں سلطنت اور اس کے مظاہر و لوازم کے لیے مستعمل ہیں، کیونکہ انسانی ذہن اسی نقشے اور انہی اصلاحات کی مدد سے کسی حد تک کائنات کی سلطانی کے معاملات کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اصل حقیقت کو انسانی فہم سے قریب تر کرنے کے لیے ہے۔ اس کو بالکل لفظی معنوں میں لے لینا درست نہیں ہے۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ۝١٨
وہ دن ہوگا جب تم لوگ پیش کیے جاؤ گے، تمہارا کوئی راز بھی چھپا نہ رہ جائے گا۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۚ۝١٩
اس وقت جس کا نامہ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا (۱۲) وہ کہے گا " لو دیکھو، پڑھو میرا نامہ اعمال (۱۳) ،

(۱۲) ۔ سیدھے ہاتھ میں نامہ اعمال کا دیا جانا ہی ظاہر کر دے گا کہ اس کا حساب بےباق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے نہیں

بلکہ صالح انسان کی حیثیت سے پیش ہو رہا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ اعمال ناموں کی تقسیم کے وقت صالح انسان خود سیدھا ہاتھ بڑھا کر اپنا نامہ اعمال لے گا، کیونکہ موت کے وقت سے میدان حشر میں حاضری تک اس کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہوگا اس کی وجہ سے اس کو پہلے ہی یہ اطمینان حاصل ہوچکا ہوگا کہ میں یہاں انعام پانے کے لیے پیش ہو رہا ہوں نہ کہ سزا پانے کے لیے۔ قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ بڑی صراحت کے ساتھ بتائی گئی ہے کہ موت کے وقت ہی سے یہ بات انسان پر واضح ہوجاتی ہے کہ وہ نیک بخت آدمی کی حیثیت سے دوسرے عالم میں جا رہا ہے یا بد بخت آدمی کی حیثیت سے۔ پھر موت سے قیامت تک نیک انسان کے ساتھ مہمان کا سا معاملہ ہوتا ہے اور بد انسان کے ساتھ حوالاتی مجرم کا سا۔ اس کے بعد جب قیامت کے روز دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے اسی وقت سے صالحین کی حالت و کیفیت کچھ اور ہوتی ہے اور کفار و منافقین اور مجرمین کی حالت و کیفیت کچھ اور (تفصیلات کے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، الانفال، آیت ۵۰۔ النحل، آیات ۲۸ و ۳۲، مع حاشیہ ۲۶۔ بنی اسرائیل، آیت ۹۷۔ جلد سوم، طٰہٰ آیات ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۲۴ تا ۱۲۶، مع حواشی ۷۹، ۸۰، ۱۰۷۔ الانبیاء، آیت ۱۰۳، مع حاشیہ ۹۸۔ الفرقان، آیت ۲۴، مع حاشیہ ۳۸۔ النمل، آیت ۸۹، مع حاشیہ ۱۰۹۔ جلد چہارم، سبا، آیت ۵۱، مع حاشیہ ۷۲۔ یٰسین، آیات ۲۶، ۲۷، مع حواشی ۲۲۔ ۲۳۔ المومن، آیات ۴۵، ۴۶، مع حاشیہ ۶۳، جلد پنجم، محمد، آیت ۲۷ مع حاشیہ ۳۷۔ ق، آیات ۱۹ تا ۲۳، مع حواشی ۲۲، ۲۳، ۲۵)

(۱۳) ۔ یعنی نامہ اعمال ملتے ہی وہ خوش ہوجائے گا اور اپنے ساتھیوں کو دکھائے گا۔ سورۃ انشقاق، آیت ۹ میں بیان ہوا ہے کہ " وہ خوش خوش اپنے لوگوں کی طرف پلٹے گا ۔"

اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ۝۲۰

میں سمجھتا تھا کہ مجھے ضرور اپنا حساب ملنے والا ہے۔ (۱۴)

(۱۴) ۔ یعنی وہ اپنی خوش قسمتی کی وجہ یہ بتائے گا کہ وہ دنیا میں آخرت سے غافل نہ تھا بلکہ یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا رہا کہ ایک روز اسے خدا کے حضور حاضر ہونا اور اپنا حساب دینا ہے۔

فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۝۲۱

پس وہ دل پسند عیش میں ہوگا،

فِیۡ جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ ﴿۲۲﴾

عالی مقام جنت میں

قُطُوۡفُہَا دَانِیَۃٌ ﴿۲۳﴾

جس کے پھلوں کے گچھے جھکے پڑ رہے ہوں گے ۔

کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا ہَنِیۡٓـئًۢا بِمَاۤ اَسۡلَفۡتُمۡ فِی الۡاَیَّامِ الۡخَالِیَۃِ ﴿۲۴﴾

(ایسے لوگوں سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ اور پیو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں ۔

وَ اَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ بِشِمَالِہٖ ۬ۙ فَیَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ لَمۡ اُوۡتَ کِتٰبِیَہۡ ﴿۲۵﴾

اور جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا (۱۵) وہ کہے گا " کاش میرا اعمال نامہ مجھے نہ دیا گیا ہوتا (۱۶)

(۱۵) ۔ سورۃ انشقاق میں فرمایا گیا ہے " اور جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا "۔ غالباً اس کی صورت یہ ہوگی کہ مجرم کو چونکہ پہلے ہی سے اپنے مجرم ہونے کا علم ہوگا اور وہ جانتا ہوگا کہ اس نامہ اعمال میں اس کا کیا کچا چٹھا درج ہے، اس لیے وہ نہایت بددلی کے ساتھ اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر اسے لے گا اور فوراً پیٹھ کے پیچھے چھپا لے گا تاکہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔

(۱۶) ۔ یعنی مجھے یہ نامہ اعمال دے کر میدان حشر میں علانیہ سب کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کیا جاتا اور جو سزا بھی دینی تھی دے ڈالی جاتی ۔

وَ لَمۡ اَدۡرِ مَا حِسَابِیَہۡ ﴿۲۶﴾

اور میں نہ جانتا کہ میرا حساب کیا ہے (۱۷) ۔

(۱۷) ۔ یعنی مجھے نہ بتایا جاتا کہ میں دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہوں ۔ دوسرا مطلب اس آیت کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں نے کبھی یہ نہ جانا تھا کہ حساب کیا بلا ہوتی ہے، مجھے کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ ایک دن مجھے اپنا حساب بھی دینا ہوگا اور میرا سب کیا کرایا میرے سامنے رکھ دیا جائے گا ۔

يٰلَيۡتَہَا كَانَتِ الۡقَاضِيَۃَ ۚ﴿۲۷﴾
کاش میری وہی موت (جو دنیا میں آئی تھی) فیصلہ کن ہوتی ۔ (۱۸)

(۱۸) ۔ یعنی دنیا میں مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے معدوم ہوگیا ہوتا اور کوئی دوسری زندگی نہ ہوتی ۔

مَاۤ اَغۡنٰی عَنِّیۡ مَالِیَہۡ ﴿۲۸﴾
آج میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا ۔

ہَلَکَ عَنِّیۡ سُلۡطٰنِیَہۡ ﴿۲۹﴾
میرا سارا اقتدار ختم ہوگیا ۔ (۱۹)

(۱۹) ۔ اصل الفاظ ہیں هلک عنی سلطٰنيہ سلطان کا لفظ دلیل و حجت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اقتدار کے لیے بھی ۔ اگر اسے دلیل و حجت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جو دلیل بازیاں میں کیا کرتا تھا وہ یہاں نہیں چل سکتیں، میرے پاس اپنی صفائی میں پیش کرنے کے لیے اب کوئی حجت نہیں رہی ۔ اور اقتدار کے معنی میں لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ دنیا میں جس طاقت کے بل بوتے پر میں اکڑتا تھا وہ یہاں ختم ہوچکی ہے ۔ اب یہاں کوئی میرا لشکر نہیں، کوئی میرا حکم ماننے والا نہیں، میں ایک بےبس اور لاچار بندے کی حیثیت سے کھڑا ہوں جو اپنے دفاع کے لیے کچھ نہیں کرسکتا ۔

خُذُوۡہُ فَغُلُّوۡہُ ﴿۳۰﴾
حکم ہوگا پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو ،

ثُمَّ الۡجَحِیۡمَ صَلُّوۡہُ ﴿۳۱﴾
پھر اسے جہنم میں جھونک دو ،

ثُمَّ فِیۡ سِلۡسِلَۃٍ ذَرۡعُہَا سَبۡعُوۡنَ ذِرَاعًا فَاسۡلُکُوۡہُ ﴿۳۲﴾
پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو ۔

اِنَّہٗ كَانَ لَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۳۳﴾
یہ نہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان لاتا تھا

وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ﴿۳۴﴾
اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا (۲۰)

(۲۰) ۔ یعنی خود کسی غریب کو کھانا کھلانا تو درکنار، کسی سے یہ کہنا بھی پسند نہ کرتا تھا کہ خدا کے بھوکے بندوں کو روٹی دے دو ۔

فَلَیۡسَ لَہُ الۡیَوۡمَ ہٰہُنَا حَمِیۡمٌ ﴿۳۵﴾
لہٰذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یار غم خوار

وَّ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ غِسۡلِیۡنٍ ﴿۳۶﴾
اور نہ زخموں کے دھو ون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا،

لَّا یَاۡکُلُہٗۤ اِلَّا الۡخَاطِـُٔوۡنَ ﴿٪۳۷﴾
جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۸﴾
پس نہیں [۲۱] ، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جو تم دیکھتے ہو

(۲۱) یعنی تم لوگوں نے جو کچھ سمجھ رکھا ہے بات وہ نہیں ہے۔

وَ مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾
اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے،

اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿۴۰﴾
یہ ایک رسول کریم کا قول ہے [۲۲] ،

(۲۲) یہاں رسول کریم سے مراد محمد ﷺ ہیں اور سورۃ تکویر (آیت ۱۹) میں اس سے مراد جبریل ؑ ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں قرآن کو رسول کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ کفار مکہ جبریل کو نہیں بلکہ محمد ﷺ کو شاعر اور کاہن کہتے تھے۔ بخلاف اس کے سورۃ تکویر میں قرآن کو رسول کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول بڑی قوت والا ہے، صاحب عرش کے ہاں بلند مرتبہ رکھتا ہے، وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے اور محمد ﷺ نے اس کو روشن افق پر دیکھا ہے۔ قریب قریب یہی مضمون سورۃ نجم آیات نمبر ۵ تا ۱۰ میں جبریل ؑ کے متعلق بیان ہوا

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کو محمد ﷺ اور جبریل ؑ کا قول کس معنی میں کہا گیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ اس کو حضور ﷺ کی زبان سے اور حضور ﷺ اسے جبریل ؑ کی زبان سے سن رہے تھے، اس لیے ایک لحاظ سے یہ حضور ﷺ کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے جبریل ؑ کا قول، لیکن آگے چل کر یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ فی الاصل یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے جو محمد ﷺ کے سامنے جبریل ؑ کی زبان سے، اور لوگوں کے سامنے محمد ﷺ کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ خود رسول کا لفظ بھی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان دونوں کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ پیغام بر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس پیغام بھیجنے والے کی طرف سے پیش کیا ہے۔

وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۙ۴۱

کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو (۲۳) ۔

(۲۳) ۔ " کم ہی ایمان لاتے ہو " کا ایک مطلب عربی محاورے کے مطابق یہ ہوسکتا ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن کو سن کر کسی وقت تمہارا دل خود پکار اٹھتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا، مگر پھر تم اپنی ضد پر اڑ جاتے ہو اور اس پر ایمان لانے سے انکار کردیتے ہو۔

وَ لَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ۴۲

اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۴۳

یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے (۲۴)

(۲۴) ۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں نظر آتا ہے اور جو کچھ تم کو نظر نہیں آتا، اس سب کی قسم میں اس بات پر کھاتا ہوں کہ یہ قرآن کسی شاعر یا کاہن کا کلام نہیں ہے بلکہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے جو ایک ایسے رسول کی زبان سے ادا ہو رہا ہے جو کریم (نہایت معزز اور شریف) ہے۔ اب دیکھیے کہ یہ قسم کس معنی میں کھائی گئی ہے۔ جو کچھ لوگوں کو نظر آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ :

(۱) اس کلام کو ایک ایسا شخص پیش کر رہا تھا جس کا شریف النفس ہونا مکے کے معاشرے میں کسی سے چھپا ہوا نہ تھا سب جانتے تھے کہ اخلاقی حیثیت سے یہ ان کی قوم کا بہترین آدمی ہے۔ ایسے شخص سے تو یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اتنا بڑا جھوٹ لے کر اٹھ کھڑا ہوگا کہ خدا پر بہتان باندھے اور اپنے دل سے ایک بات گھڑ کر اسے خداوند عالم کی طرف منسوب کر دے۔

(۲) وہ یہ بھی علانیہ دیکھ رہے تھے کہ اس کلام کو پیش کرنے میں اپنا کوئی ذاتی مفاد اس شخص کے پیش نظر نہیں ہے، بلکہ یہ کام کر کے تو اس نے اپنے مفاد کو قربان کردیا ہے۔ اپنی تجارت کو برباد کیا۔ اپنے عیش و آرام کو تج دیا۔ جس معاشرے میں اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا، اسی میں گالیاں کھانے لگا۔ اور نہ صرف خود بلکہ اپنے بال بچوں تک کو ہر قسم کے مصائب میں مبتلا کرلیا۔ ذاتی مفاد کا خواہشمند ان کانٹوں میں اپنے آپ کو کیوں گھسیٹتا ؟

(۳) ان کی آنکھیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ انہی کے معاشرے میں سے جو لوگ اس شخص پر ایمان لا رہے تھے ان کی زندگی میں یک لخت انقلاب برپا ہوجاتا تھا۔ کسی شاعر یا کاہن کے کلام میں یہ تاثیر آخر کب دیکھی گئی ہے کہ وہ لوگوں میں ایسی زبردست اخلاقی تبدیلی پیدا کر دے اور اس کے ماننے والے اس کی خاطر ہر طرح کے مصائب و آلام برداشت کرنے کے لیے تیار ہوجائیں ؟

(۴) ان سے یہ بات بھی چھپی ہوئی نہ تھی کہ شعر کی زبان کیا ہوتی ہے اور کاہنوں کا کلام کیسا ہوتا ہے۔ ایک ہٹ دھرم آدمی کے سوا کون یہ کہہ سکتا تھا کہ قرآن کی زبان شاعری یا کہانت کی زبان ہے (اس پر مفصل بحث ہم تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷، جلد چہارم، الشعراء حواشی ۱۴۲ تا ۱۴۵، اور جلد پنجم، الطور حاشیہ ۲۲ میں کرچکے ہیں)۔

(۵) یہ بات بھی ان کی نگاہوں کے سامنے تھی کہ پورے عرب میں کوئی شخص ایسا فصیح وبلیغ نہ تھا جس کا کلام قرآن کے مقابلے میں لایا جاسکتا ہو۔ اس کے برابر تو درکنار، اس کے قریب تک کسی کی فصاحت و بلاغت نہیں پہنچتی تھی۔

(٦) ان سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ خود محمد ﷺ کی زبان بھی اپنی ادبی شان کے لحاظ سے قرآن کی ادبی شان سے بہت مختلف تھی۔ کوئی اہل زبان حضور ﷺ کی اپنی تقریر، اور قرآن کو سن کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہیں۔

(۷) قرآن جن مضامین اور علوم پر مشتمل تھا، دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی مکے کے لوگوں نے کبھی وہ باتیں محمد ﷺ کی زبان سے نہ سنی تھیں، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان معلومات کے حصول کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے مخالفین اگر یہ الزامات لگاتے بھی تھے کہ آپ کہیں سے خفیہ طریقے پر یہ معلومات حاصل کرتے ہیں تو مکے میں کوئی شخص ان کو باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا (اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن جلد دوم، النحل حاشیہ ۱۰۷، اور جلد سوم الفرقان، حاشیہ ۱۲ میں کرچکے ہیں)۔

(۸) زمین سے لے کر آسمان تک اس عظیم الشان کارخانۂ ہستی کو بھی اپنی آنکھوں سے چلتا ہوا دیکھ رہے تھے جس میں ایک

زبردست حکیمانہ قانون اور ہمہ گیر نظم و ضبط کار فرما نظر آ رہا تھا۔ اس کے اندر کہیں اس شرک اور انکار آخرت کے لیے کوئی شہادت نہیں پائی جاتی تھی جس کے اہل عرب معتقد تھے، بلکہ ہر طرف توحید اور آخرت ہی کی صداقت کے شواہد ملتے تھے جسے قرآن پیش کر رہا تھا۔

یہ سب کچھ تو وہ دیکھ رہے تھے۔ اور جو کچھ وہ نہیں دیکھ رہے تھے وہ یہ تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق ومالک اور فرمانروا ہے، کائنات میں سب بندے ہی بندے ہیں، خدا اس کے سوا کوئی نہیں ہے، قیامت ضرور برپا ہونے والی ہے، محمد ﷺ کو واقعی اللہ تعالیٰ ہی نے اپنا رسول مقرر کیا ہے، اور ان پر اللہ ہی کی طرف سے یہ قرآن نازل ہو رہا ہے۔ ان دونوں قسم کے حقائق کی قسم کھا کر وہ بات کہی گئی ہے جو اوپر کی آیات میں ارشاد ہوئی ہے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۴۴
اور اگر اس (نبی) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی

لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۴۵
تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے

ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۴۶
اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے،

فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۴۷
پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا [۲۵]

(۲۵) ۔ اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ نبی کو اپنی طرف سے وحی میں کوئی کمی بیشی کرنے کا اختیار نہیں ہے، اور اگر وہ ایسا کرے تو ہم اس کو سخت سزا دیں۔ مگر اس بات کو ایسے انداز سے بیان کیا گیا ہے جس سے آنکھوں کے سامنے یہ تصویر کھنچ جاتی ہے کہ ایک بادشاہ کا مقرر کردہ افسر اس کے نام سے کوئی جعلسازی کرے تو بادشاہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کا سر قلم کر دے۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ غلط استدلال کیا ہے کہ جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کرے، اس کی رگ دل یا رگ گردن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً نہ کاٹ ڈالی جائے تو یہ اس کے نبی ہونے کا ثبوت ہے۔ حالانکہ اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ سچے نبی کے بارے میں ہے، نبوت کے جھوٹے مدعیوں کے بارے میں نہیں ہے۔ جھوٹے مدعی تو نبوت ہی نہیں خدائی تک کے دعوے کرتے ہیں اور زمین پر مدتوں دندناتے پھرتے ہیں، یہ ان کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث ہم تفہیم القرآن، جلد دوم، تفسیر سورۂ یونس حاشیہ ۲۳ میں کرچکے ہیں۔

وَ اِنَّہٗ لَتَذۡکِرَۃٌ لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۴۸
درحقیقت یہ پرہیزگار لوگوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ [۲۶]

(۲۶) ۔ یعنی قرآن ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو غلط روی اور اس کے برے نتائج سے بچنا چاہتے ہیں (تشریح کے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۳)۔

وَ اِنَّا لَنَعۡلَمُ اَنَّ مِنۡکُمۡ مُّکَذِّبِیۡنَ ۴۹
اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں۔

وَ اِنَّہٗ لَحَسۡرَۃٌ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ۵۰
ایسے کافروں کے لیے یقینا یہ موجب حسرت ہے۔ [۲۷]

(۲۷) ۔ یعنی آخر کار انہیں اس بات پر پچھتانا پڑے گا کہ انہوں نے کیوں اس قرآن کی تکذیب کی۔

وَ اِنَّہٗ لَحَقُّ الۡیَقِیۡنِ ۵۱
اور یہ بالکل یقینی حق ہے۔

فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ ۵۲
پس اے نبی ، اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو